© rasailojaraid.com

اسلام کا فلسفۂ تاریخ

عبدالحمید

تاریخ اقوام و ملل کے عروج و زوال کی ایک دلچسپ مگر عبرتناک داستان ہے۔ اس کے مطالعہ سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ کن کن اسباب کی بنا پر قومیں دنیا میں ترقی کرتی ہیں اور کونسی کمزوریاں انہیں قعر مذلت میں لے جاتی ہیں۔

انہی اسباب کی چھان بین برسوں سے جاری ہے مگر آج تک ان کا صحیح طور پر تعین نہیں ہو سکا۔ بعض مفکرین قوموں کے عروج و زوال کو صرف جغرافیائی حالات کا نتیجہ سمجھتے ہیں، بعض اسے محض بخت و اتفاق سے تعبیر کرتے ہیں، بعض اسے ایک اچھی لیڈرشپ کی کرشمہ سازی خیال کرتے ہیں۔ ایک صاحب[1] نے بڑے ہی غور کے بعد فرمایا کہ اس دنیا میں بناؤ اور بگاڑ کا جو کھیل کھیلا جا رہا ہے وہ صرف روح مطلق (Absolute Spirit) کے سفر ارتقا کی وجہ سے ہے۔[2] ان کے بعد ایک دوسرے مفکر[3] نے بڑے زور سے یہ دعویٰ کیا کہ دنیا کے سارے انقلابات کے پیچھے صرف معاشی محرکات ہی کام کر رہے ہیں۔

اسلام ایک الگ ضابطۂ حیات ہونے کی وجہ سے اس معاملہ میں بھی اپنا ایک مخصوص نظریہ رکھتا ہے جو مبادیات سے لے کر تفصیلات تک دوسروں سے بالکل مختلف ہے۔ اس مضمون میں ہم اسی نظریہ کی وضاحت کرنا چاہتے ہیں۔ مگر اس کے متعلق کسی تفصیلی گفتگو کرنے سے پیشتر مناسب یہ ہے کہ ہم ایک نگاہ اس حیثیت پر بھی ڈال لیں جو دنیا کے مختلف فلسفے انسان کو اس کائنات میں دیتے ہیں۔ اس سے اس مسئلہ کے سمجھنے میں بہت حد تک آسانی ہوگی۔

مغربی مفکرین فکر و نظر کے باہمی اختلافات کے باوجود جس معاملہ میں ایک دوسرے کے ہمنوا ہیں

---

[1] بکل Buckle [2] ہیگل Hegel [3] مارکس Marx

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وہ یہ کہ اُن کے نزدیک اصل حقیقت صرف اجتماعیت ہے، انفرادیت اُن کے خیال میں محض ایک سراب ہے۔ اسی نظریہ کی بنیاد پر انہوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ سماج ایک نامیہ (Organism) ہے جس میں فرد ایک خلیہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ بیچارہ اسی رخ پر چل سکتا ہے جس طرف اجتماعیت اُسے اجازت دے۔ اُس کا اپنا الگ کوئی وجود نہیں۔ شپنگلر نے اسی نظریہ کو پیش کیا۔ ہیگل (Hegel) نے تھوڑے سے تغیّر کے ساتھ یہی کچھ کہا۔ اس کے نزدیک زندگی کی یہ ساری کشمکش اور پیکار دو رحقیقت روحِ مطلق ہی کے مظاہر ہیں۔ انسان اس ساری کشمکش میں محض ایک آلۂ کار کی حیثیت سے کام کرتا ہے اس کے عزائم، اس کی ضروریات، اس کے افکار غرضیکہ اُس کی پوری زندگی کی تشکیل اور صورت بندی روحِ مطلق خود اپنی اغراض کی تکمیل کے لیے کرتی ہے۔ انسان اس زعم میں مبتلا ہے کہ وہ آزاد ہے اور جو کچھ کر رہا ہے اپنے عزائم کی تکمیل کے لیے کر رہا ہے لیکن حقیقت کچھ اور ہے۔ انسان کی زندگی روحِ عالم (World spirit) کے ہاتھ میں ایک کھلونا ہے محض ایک کٹھ پتلی جسے وہ جدھر چاہتی ہے گھما دیتی ہے۔ نہ اس کے افکار اپنے ہیں نہ تظریات و مقاصد اپنے۔

یہی حال مارکس کا ہے۔ وہ انسان کو بندۂ مجبور سمجھتا ہے۔ اس کا عقیدہ یہ ہے کہ انسان حالات کی پیداوار ہے اور ان حالات کے بنانے میں اصل اور فیصلہ کن قوت معاشی ہے۔ انسان خالصتاً طور پر معاشی محرکات کے اشاروں پر چل رہا ہے۔ یہ محرکات جس رخ پر چاہیں اُسے لے جاتے ہیں۔ جس سانچے میں چاہیں اُسے ڈھال دیتے ہیں اور جن مقاصد کے لیے چاہیں اُسے استعمال کرتے ہیں۔ وہ خود کچھ بھی نہیں

——— اسلام انسان کے متعلق اس نظریہ کا سخت مخالف ہے۔ وہ انسان کو خدا کا نائب اور خلیفہ سمجھتا ہے۔

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّىْ جَاعِلٌ فِى الْاَرْضِ خَلِيْفَةً ط قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ط	اور جس وقت آپ کے رب نے فرشتوں سے ارشاد فرمایا کہ میں زمین میں ایک نائب بناؤں گا تو فرشتے کہنے لگے کہ کیا آپ اس زمین میں ایسے لوگوں کو مقرر کریں گے جو یہاں فساد اور خونریزی کریں گے، حالانکہ ہم تیری حمد کے ساتھ تسبیح و تیری تقدیس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قَالَ اِنِّیْۤ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۔ (۲ : ۳۰)

کرتے ہیں اللہ نے فرمایا میں وہ باتیں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے ۔

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓىِٕكَةِ اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ۝ فَاِذَا سَوَّیْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِیْنَ ۝

اور جب کہ تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں ایک کالے سڑے ہوئے سوکھے گارے سے ایک بشر بنانے والا ہوں۔ پھر جب میں اس میں اپنی روح میں سے کچھ پھونک دوں تو تم اس کے لیے سربسجود گر جانا ۔

اس مضمون کو قرآن پاک میں مختلف طریقوں سے متعدد مقامات پر بیان کیا گیا ہے اور ان کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کو خدا نے زمین میں اپنا نائب بنایا اس کو فرشتوں سے بڑھ کر علم عطا کیا۔ اور اس کے علم کو فرشتوں کی تسبیح و تقدیس پر ترجیح دی ، فرشتوں کو حکم دیا کہ میرے اس نائب کو سجدہ کرو۔ فرشتوں نے اس کو سجدہ کیا اور اس طرح ملکوتیت اس کے آگے جھک گئی مگر ابلیس نے انکار کیا اور اس طرح شیطانی قوتیں انسان کے آگے نہ جھکیں حقیقت میں تو وہ مٹی کا ایک حقیر سا پتلا تھا مگر خدا نے اس میں جو روح پھونکی تھی اور اس کو جو علم بخشا تھا اس نے اسے نیابتِ خداوندی کا اہل بنا دیا۔

یہ ہے وہ مقام جہاں اسلام اور مغربی فلسفہ کی راہیں ایک دوسرے سے الگ ہو جاتی ہیں۔ مغربی فلسفہ کی رُو سے انسان ایک حیوانِ ناطق ہے۔ مگر اسلام میں وہ نائبِ خدا ہے۔ خالق کائنات نے جو کچھ پیدا کیا ہے وہ صرف اسی کی ذات کے لیے ہے۔ چنانچہ قرآن میں ارشاد ہے ۔

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِیْۤ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِیْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِیْلًا ۔ (۱۷ : ۷۰)

ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی اور ان کو خشکی اور تری میں سواریاں دیں اور ان کو پاک چیزوں سے رزق عطا کیا اور بہت سی ان چیزوں پر جو ہم نے پیدا کی ہیں ان کو ایک طرح کی فضیلت عطا کی ہے ۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ (۲۲ : ۶۵)

اے انسان کیا تو نہیں دیکھتا کہ اللہ نے ان چیزوں کو جو زمین میں ہیں تمہارے لیے مطیع بنا دیا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

"اور جانوروں کو پیدا کیا جن میں تمہارے لیے سردی سے حفاظت کا سامان ہے۔ اور منفعتیں ہیں اور ان میں سے بعض کو تم کھاتے ہو۔ ان میں تمہارے لیے ایک شان جمال ہے۔ جب کہ صبح تم ان کو لے جاتے ہو اور شام واپس لاتے ہو وہ تمہارے بوجھ ڈھو کر اس مقام تک لے جاتے ہیں جہاں تک تم بغیر جانکاہی کے نہیں پہنچ سکتے۔ تمہارا رب بڑا مہربان اور رحم کرنے والا ہے گھوڑے اور خچر اور گدھے تمہاری سواری کے لیے ہیں اور سامانِ زینت ہیں۔ خدا اور بہت سی چیزیں پیدا کرتا ہے جن کا تم کو علم بھی نہیں ہے . . . .
وہی ہے جس نے آسمان سے پانی اتارا، اس میں سے کچھ تمہارے پینے کے لیے ہے اور کچھ درختوں کی پرورش کے کام آتا ہے جن سے تم اپنے جانوروں کا چارہ حاصل کرتے ہو۔ اس پانی سے خدا تمہارے لیے کھیتی اور کھجور اور انگور اور طرح طرح کے پھل اگاتا ہے، ان چیزوں میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر سے کام لیتے ہیں۔ اسی نے تمہارے لیے رات اور دن اور سورج اور چاند اور تارے مسخر کیے ہیں۔ یہ سب اسی خدا کے حکم سے مسخر ہیں، ان میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں، اور بہت سی وہ مختلف الالوان چیزیں جو اس نے زمین میں تمہارے لیے پیدا کی ہیں، ان میں سبق حاصل کرنے والوں کے لیے بڑی نشانی ہے اور وہ خدا ہی ہے جس نے سمندر کو مسخر کیا کہ اس سے تم تازہ گوشت (مچھلی نکال کر) کھاؤ اور زینت کا سامان (موتی وغیرہ) جن کو تم پہنتے ہو۔ اور تو دیکھتا ہے کہ کشتیاں پانی کو چیرتی ہوئی سمندر میں بہتی چلی جاتی ہیں چنانچہ سمندر کو اس لیے بھی مسخر کیا ہے کہ تم لوگ اللہ کا فضل تلاش کرو (یعنی تجارت کرو) شاید کہ تم شکر بجا لاؤ۔ اس نے زمین میں پہاڑ جما دیئے کہ زمین تم کو لے کر جھک نہ جائے اور دریا اور راستے بنا دیئے کہ تم منزلِ مقصود کی راہ پاؤ، اور بہت سی علامات بنائیں منجملہ ان کے تارے بھی ہیں جن سے لوگ راستہ معلوم کرتے ہیں . . . اگر تم خدا کی نعمتوں کا شمار کرو تو ان کو بے حساب پاؤ گے۔ (۱۶: ۱-۲)

ان آیات میں انسان کو بتایا گیا ہے کہ زمین میں جتنی چیزیں ہیں وہ سب تیری خدمت اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فائدے کے لیے مسخر کی گئی ہیں اور آسمان کی بھی بہت سی چیزوں کا یہی حال ہے۔ یہ درخت، یہ سورج، یہ ستارے غرض یہ سب چیزیں جنہیں تو دیکھ رہا ہے تیری خادم ہیں، تیری منفعت کے لیے ہیں اور تیرے لیے ان کو کارآمد بنایا گیا ہے تو ان سب پر فضیلت رکھتا ہے۔ لہٰذا تو اپنے ان خدام سے کام لے مگر ایک غیر ذمہ دار اور غیر مسئول حاکم کی طرح نہیں بلکہ نیابت کی ذمہ داریوں کو اچھی طرح سمجھتے ہوئے۔ تیری نیابت جہاں تجھ کو فضیلت عطا کرتی ہے وہاں تم پر بہت سی ذمہ داریاں بھی ڈالتی ہے جن سے اچھی طرح عہدہ برا ہو کر ہی تو نیابت کا صحیح معنوں میں مستحق ہو سکتا ہے۔ بحیثیت نائب کے تیرا یہ فرض ہے کہ تو جس کا نائب ہے اس کی اطاعت کرے، اگر تو ایسا نہیں کرتا ہے تو تو باغی ہے اور اس کا مجاز نہیں ہے کہ اپنے آقا کی رعیت اور اس کے نوکروں اور خادموں اور غلاموں کو خود اپنی رعیت اپنا نوکر، اپنا خادم اور اپنا غلام بنالے، اگر تو ایسا کرے گا تب بھی تو باغی قرار دیا جائے گا اور دونوں حالتوں میں سزا کا مستحق ہو گا۔ تجھ کو جس جگہ نائب بنایا گیا ہے وہاں تو اپنے آقا کی املاک میں تصرف کر سکتا ہے، ان سے خدمت لے سکتا ہے، ان کی نگرانی کر سکتا ہے مگر اس حیثیت سے نہیں کہ تو خود آقا ہے اور نہ اس حیثیت سے کہ اس آقا کے سوا تو کسی اور کا ماتحت ہے بلکہ صرف اس حیثیت سے کہ تو اپنے آقا کا نائب ہے اور جتنی چیزیں اس کے زیر حکم ہیں ان پر اپنے آقا کا امین ہے۔ اس بنا پر تو سچا اور پسندیدہ اور مستحق انعام نائب اسی وقت ہو سکتا ہے جبکہ اپنے آقا کی امانت میں خیانت نہ کرے اس کی ہدایت پر عمل کرے، اس کے احکام سے سرتابی نہ کرے، اس کی املاک اس کی رعیت اس کے نوکروں، اس کے خادموں اور اس کے غلاموں پر حکومت کرے، ان سے خدمت لینے، ان میں تصرف کرنے اور ان کی نگرانی کرنے میں اس کے بنائے ہوئے قوانین پر کاربند ہو۔ اگر تو ایسا نہ کرے گا تو نائب نہیں باغی ہو گا، پسندیدہ نہیں مردود ہو گا، مستحقِ انعام نہیں مستوجب سزا ہو گا“۔

اس ضمن میں ایک اور ضروری بات جو توجہ کے قابل ہے وہ یہ کہ اسلام کی تعلیم کے مطابق کوئی مخصوص فرد یا گروہ نائبِ خدا نہیں بلکہ پوری نوع انسانی کو یہ فضیلت عطا کی گئی ہے اور دنیا کا ہر فرد خلیفۂ خدا ہونے کی حیثیت سے دوسرے انسانوں کے برابر ہے۔ ایک انسان، دوسرے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انسان سے جس چیز کا مطالبہ کر سکتا ہے وہ صرف یہی ہے کہ وہ آقا کے حکم اور اُس کی ہدایت کی پیروی کرے اس معاملہ میں پیروی کرنے والا، اطاعت کیش اور پیروی نہ کرنے والا باغی اور سرکش ہے کیونکہ جو نیابت کا حق ادا کرتا ہے وہ حقِ نیابت نہ ادا کرنے والے سے بہتر ہے مگر فضیلت کے یہ معنی نہیں کہ وہ خود اُس کا آقا ہے۔

دوسرے نیابت اور امانت کا منصب ہر انسان کو شخصاً شخصاً حاصل ہے۔ اس میں کوئی مشترک ذمہ داری نہیں۔ اس لیے ہر شخص اپنی اپنی جگہ اس منصب کی ذمہ داریوں کے بارے میں جواب دہ ہے۔ یہاں ہر شخص کو اپنی صلیب خود اٹھانا ہے۔ اس معاملہ میں نہ زید کے عمل کی ذمہ داری بکر پر عائد ہوتی ہے اور نہ ایک کو دوسرے کے عمل کا فائدہ حاصل ہو سکتا ہے۔ نہ کوئی کسی کو اس کی ذمہ داریوں سے سبکدوش کر سکتا ہے اور نہ کسی کی غلط روی کا وبال دوسرے پر پڑ سکتا ہے۔ قرآن پاک میں مختلف مقامات پر اس امر کی وضاحت کی گئی ہے۔ لیس للانسان الا ما سعیٰ اور لہا ما کسبت وعلیہا ما اکتسبت کہہ کر ہر فرد بشر کو کلیۃً اس کے اعمال کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے۔ اگر کوئی شخص پاک بازی کی زندگی بسر کرتا ہے تو اس کا فائدہ اسی کو پہنچے گا (ومن تزکّٰی فانما یتزکّٰی لنفسہٖ) اگر کوئی محنت اور مشقت کرے گا تو اس کا فائدہ بھی خود اسی کو حاصل ہوگا (ومَن جاھَدَ فاِنّما یُجاھِدُ لِنفسِہٖ) اور اگر کوئی نیکی کی راہ اختیار کرتا ہے تو اس میں اس کی اپنی ہی فلاح ہے۔ (اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِکُمْ وَاِنْ اَسَأْتُمْ فَلَهَا) جس کسی نے اپنی زندگی میں ذرہ بھر بھلائی کی تو وہ اس کا پھل پائے گا اور جس نے ذرہ برابر برائی کی تو وہ بھی اس کا نتیجہ دیکھ لے گا (فَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَیْرًا یَّرَهٗ وَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا یَّرَهٗ)

یہ ذمہ داری کا منصب ظاہر بات ہے کہ کسی بندۂ مجبور کو نہیں دیا جا سکتا۔ اگر ایک فرد اس فرض کی بجا آوری کے لیے مجبور ہی ہے تو اس میں انسانیت کا کمال کیا ہے۔ اس بارِ امانت کے حامل اور اس خلیفۃ اللہ فی الارض کی امتیازی خصوصیت جس کی بنا پر یہ دوسری مخلوقات سے ممتاز ہو گیا ہے یہ ہے کہ اسے طبعاً اطاعت کیش نہیں بنایا گیا بلکہ اسے عمل کی قوت عطا کر دی گئی ہے جس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کام سے کر وہ غلط راستہ پر بھی جا سکتا ہے اور صحیح پر بھی ——————۔ خداوند تعالیٰ کے نظامِ کُلی کے تحت قوانین و حدودِ الٰہیہ کا پابند ہونے کے باوجود وہ ایک خاص دائرہ میں مجبورانہ اطاعت سے آزاد ہے اور اتنا اختیار رکھتا ہے کہ چاہے اطاعت کرے اور چاہے سرکشی و نافرمانی کرنے لگے۔

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا ۠ وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝ (النساء-۲)

اور جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے اللہ اسے ایسی جنتوں میں داخل کردیگا جن کے نیچے نہریں بہتی ہونگی جن میں وہ ہمیشہ رہیگا یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔ اور جو اللہ اور رسول کی نافرمانی کریگا اور اس کی حدود سے تجاوز کرے گا اُسے دوزخ میں ڈال دیا جائے گا جہاں وہ ہمیشہ رہے گا۔ اور اس کے لیے رسوا کرنے والا عذاب ہوگا۔

یہ اور ایسی ہی بیشمار آیات ظاہر کرتی ہیں کہ انسان میں بخلاف دوسری مخلوق کے ایک ایسی قوت موجود ہے جس سے وہ اطاعت اور سرکشی دونوں پر قدرت رکھتا ہے اور اس قوت کے صحیح یا غلط استعمال سے وہ فوز یا خُسران، ثواب یا عقاب انعام یا غضب کا مستحق ہوتا ہے۔

اگر انسان سے یہ آزادیٔ عمل سلب کرلی جائے تو اخلاق کا سارا فلسفہ بالکل بیکار ہو جاتا ہے پھر اُس میں اور ایک مشین میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا اور انسان کی پوری مذہبی اور اخلاقی زندگی ایک کھیل تماشہ سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ قرآن پاک کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ وہ خالق کائنات جس نے ہمیں اس دنیا میں پیدا کیا ہے، ہمیں علم دیا ہے، غور و فکر اور ارادے اور فیصلے کی قوتیں عطا کی ہیں۔ جس نے ہمیں نیک و بد میں تمیز کرنے کا احساس بخشا ہے۔ اُس نے یہ سب کچھ ہمارے ساتھ مذاق کے طور پر نہیں کیا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جس کارساز نے ہمیں بھلائی اور برائی کے درمیان فرق کرنا سکھایا ہے اُس نے ہمیں محدود پیمانہ پر کچھ اختیارات بھی دے رکھے ہیں اور ان اختیارات کے استعمال میں ہمیں مناسب حد تک آزادی بھی دی گئی ہے اور پھر اس کے بعد ہمیں ہدایت کی گئی ہے کہ ہم از خود جادۂ مستقیم پر گامزن ہوں۔ چنانچہ اس دور کے ایک بڑے مفکر ڈاکٹر اقبال مرحوم نے اپنی کتاب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

"اسلامی الٰہیات کی جدید تشکیل" میں فرمایا ہے:-

"جنت میں آدم کی زندگی دراصل انسانیت کے اس ابتدائی دور سے عبارت ہے جب کہ اس میں احساس خودی پیدا نہ ہوا تھا اور اس نے اپنے ارادے اور علم کی قوت سے ماحول سے مطابقت کرنا نہیں سیکھا تھا۔ اس کا دل آرزو اور احتیاج کی خلش سے بیگانہ تھا۔ یہ واقعہ (یعنی آدم کا جنت سے نکلنا) دراصل اس حقیقت کی یادگار ہے کہ کس طرح انسان نے اپنے جبلی میلانات کے دائرہ سے باہر قدم نکالا اور ایک آزادانہ اور با اختیار ایغو کا مالک بنا۔ اس میں آگہی، وقوف، شک اور خلاف ورزی کی صلاحیت پیدا ہوگئی۔ آغوشِ فطرت میں طویل خواب کے بعد اب وہ بیدار ہوا اور اس کو پہلی دفعہ یہ محسوس ہوا کہ واقعات وحوادث کے اسباب اس کی ذات میں پنہاں ہیں۔ آدم کی نافرمانی اس کے لیے ایک سبق تھی۔ اس طرح اس نے اپنے اختیار و ارادہ کو برتنا سیکھا۔ اسی لیے اس کا قصور معاف کر دیا گیا۔" (روح اقبال از یوسف حسین خاں)

یہ ارادہ و اختیار جس طرح ایک فرد کو ملا ہے اسی طرح قوموں کے حصہ میں بھی آیا ہے۔ قومیں اور جماعتیں بےجان مادے کے برعکس، جو سابقہ علتوں کے اثرات کو خود بدل نہیں سکتا، اپنے طرزِ عمل کو تبدیل کرکے دنیا میں کامیاب و کامران ہو سکتی ہیں۔ افراد کی طرح قومیں اور جماعتوں کے حالات قانونِ علت و معلول کی جکڑ بندیوں سے کافی حد تک آزاد ہوتے ہیں۔ اس بارے میں قرآنِ پاک نے بڑی صراحت سے فرمایا ہے:-

إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنفُسِهِمْ ۔ اللہ تعالیٰ کسی قوم کو اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک کہ اس کے افراد اپنے آپ کو نہ بدلیں۔

اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ اگر کوئی قوم اپنی تقدیر کو بدلنے کا ارادہ کرے تو اسے ایسا کرنے پر اختیار ہے۔ خداوند تعالیٰ اس کی اس معاملہ میں معاونت فرماتے ہیں۔

اس کے علاوہ اسلام انسان کے پیدائشی گناہ گار ہونے کے تصور کو باطل سمجھتا ہے۔ اس کے نزدیک جنت سے نکلا ہوا انسان پیدائشی مجرم نہیں ہے افرادِ انسانی کو فطرۃ اللہ پر مخلوق قرار دیتا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور اُن کے ذہنی اور بدنی خوبی کے متعلق یہ تصور رکھتا ہے کہ وہ اگرچہ بھلائی اور برائی کے دو گونہ رجحانات کے زیرِ اثر آ سکتے ہیں لیکن وہ فی الجملہ انسان کو خیر کی طرف زیادہ آسانی سے مائل کرنے والا تسلیم کرتا ہے۔ انسان کی فطرت سے اُسے کوئی مایوسی نہیں۔

یہی وہ فرق ہے جو اسلام اور دوسرے مذاہب کے درمیان بھی پایا جاتا ہے۔ مسیحی تصور کے مطابق دنیا سرتاپا گناہ ہے۔ خواہشاتِ نفسانی اور احساسِ خودی دراصل آدم کی اُس لغزش کا نتیجہ سمجھے جاتے ہیں جس کی وجہ سے اُسے جنت سے نکالا گیا۔ اسی بنا پر عیسائیوں کے ہاں اس خیال کا عام چرچا رہا ہے کہ اگرچہ اس کائنات کا خالق خداوند تعالیٰ ہی ہے مگر اس کو تخلیق کرنے کے بعد اس کے نظم و نسق کو چلانے کی غرض سے اُسے شیطان کے حوالے کر دیا گیا تاکہ جس طرح چاہے وہ اس سرزمین میں فسق و فجور پھیلاتا پھرے اور اس معاملہ میں اس کی راہ میں کوئی چیز مزاحم نہ ہو۔ اس تعلیم کی رُو سے انسان فطرۃً ذلیل و حقیر ہے اور اس وجہ سے وہ کسی ذمہ داری کا اہل نہیں ہو سکتا۔ آدم کے جنت سے نکلنے اور دنیا میں آنے کے متعلق مسیحی اور اسلامی تعلیمات میں جو فرق ہے وہ دراصل زندگی کے اس نقطۂ نظر پر مبنی ہے جو ان مذہبوں نے اپنے پیرؤں کے لیے پیش کیا۔

قریب قریب یہی یا اس سے کچھ بڑھ کر حال بدھ مت اور جین مت کا ہے۔ ان دونوں نے بھی زندگی کی خواہشات کو کچلنے اور اپنے وجود کے فنا کرنے میں انسانی عظمت کا راز سمجھا ہے۔ اس کے برعکس قرآن نے جو نظریہ پیش کیا ہے اس کے مطابق انسان کی سعادت و فلاح صرف اسی صورت میں ممکن ہے جبکہ وہ تمام صلاحیتوں کو کام میں لا کر اپنی خودی کو ہدایت الٰہی کے مطابق مستحکم کرے۔ اسلام جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے انفرادی ذمہ داری اور سعی و عمل کو زندگی کا اصل الاصول قرار دیتا ہے جس سے اس کی ظاہری اور باطنی خوبیوں کو اجاگر کرنا مقصود ہے۔ اگر وہ دنیا میں ذلیل و خوار ہوتا ہے، اگر وہ فسق و فجور کی راہ اختیار کرتا ہے تو یہ کسی قدرتی دباؤ کے تحت نہیں اور نہ وہ پیدائشی گناہگار ہونے کی وجہ سے ایسا کرنے پر مجبور ہے۔ قرآن کی رُو سے وہ نیکی پہ پیدا کیا گیا ہے۔ اب اگر وہ فضیلت کے اعلیٰ معیار سے گرتا ہے اور اس مقامِ محمود کو چھوڑتا ہے جو خالقِ کائنات نے اُسے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بخشتا ہے تو یہ اس کی اپنی ہی سیہ کاریوں کا نتیجہ ہے۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ٥ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ ۙ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُوْنٍ ٥

ہم نے بنایا آدمی کو بہترین اندازہ پر۔ پھر ہم اسے پستی کی حالت والوں سے بھی پست تر کر دیتے ہیں، مگر جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک کام کیے سو ان کے لیے بے انتہا اجر ہے۔

قرآن حکیم اس دنیا کو دارالعذاب نہیں سمجھتا بلکہ اسے آزمائش گاہ خیال کرتا ہے جس میں آکر انسان کو اپنی صلاحیتوں کے ابھارنے کا موقع دیا جاتا ہے۔ اگر وہ اس امتحان میں کامیاب ہو جائے تو پھر اس کے لیے بھلائی ہی بھلائی ہے اور اگر وہ اس میں ناکام ہوتا ہے تو دنیا اور آخرت دونوں میں اسے رسوا ہونا پڑتا ہے۔ خداوند تعالیٰ نے اسے نیابت عطا کرنے کے بعد یہ بتایا ہے کہ اس کا مقصد کیا ہے۔

وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّیَبْلُوَكُمْ فِیْ مَآ اٰتٰىكُمْ ؕ (۲۰:۶)

وہ اللہ ہی ہے جس نے تم کو زمین میں نائب بنایا اور تم میں سے بعض کو بعض سے اونچے درجے دیئے تاکہ جو کچھ اس نے تم کو دیا ہے اس میں تمہاری آزمائش کرے۔

قَالَ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ یُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَیَسْتَخْلِفَكُمْ فِی الْاَرْضِ فَیَنْظُرَ كَیْفَ تَعْمَلُوْنَ (۱۴:۷)

(موسیٰ نے بنی اسرائیل سے کہا) قریب ہے کہ خدا تمہارے دشمن کو ہلاک کر دے اور تمہیں زمین کی خلافت دے تاکہ دیکھے کہ تم کیسے عمل کرتے ہو۔

یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِیْفَةً فِی الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَیْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَیُضِلَّكَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ الَّذِیْنَ یَضِلُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِیْدٌۢ بِمَا نَسُوْا

اے داؤد! ہم نے تجھ کو زمین میں اپنا نائب بنایا ہے پس تو لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ حکومت کر اور اپنی خواہشات کی پیروی نہ کر یہ تجھے اللہ کے راستہ سے بھٹکا دیں گی۔ جو لوگ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یوم الحساب (۳۸ : ۲) — اللہ کے راستے سے بھٹک چکے ہیں ان کے لیے اس بنا پر عذاب ہے کہ وہ حساب کے دن کو بھول چکے ہیں۔

یہ آیات اس حقیقت کی ترجمان ہیں کہ خداوند تعالیٰ نے ہمیں اپنی خلافت سے اس لیے نوازا ہے کہ ہم اس آزمائش میں پورے اتریں۔ ظاہر بات ہے کہ جب خدا نے ہمیں اس امتحان گاہ میں اتارا ہے تو اس نے ہماری کامیابی اور ناکامی کا ایک معیار بھی ضرور رکھا ہے جس پر جانچ کر وہ بعض کو کامیاب اور بعض کو ناکام کرتا ہے۔ اس کی مشیت کوئی اندھی بہری قوت نہیں جس کا کوئی اصول اور ضابطہ ہی نہ ہو۔ وہ جب کسی قوم کو دنیا میں سربلند کرتا ہے تو اس میں ایسی خوبیاں ضرور پائی جاتی ہیں جو اسے اس کا مستحق ٹھہراتی ہیں۔ اور جب کسی قوم کو پستی کی طرف دھکیلتا ہے تو اس میں ایسی برائیاں پیدا ہو جاتی ہیں جو اسے عروج کے مقام پر رہنے کے قابل نہیں چھوڑتیں۔ خداوند تعالیٰ از خود کسی قوم سے اپنی عطا کردہ عنایات واپس نہیں لیتے۔ وہ اس وقت ان نوازشوں کو چھینتے ہیں جب قوم اپنی بدکرداری سے یہ ثابت کر دیتی ہے کہ وہ ان کی اہل نہیں۔

ذَالِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ۔ — اللہ تعالیٰ کسی قوم سے اپنی عطا کردہ نعمتیں واپس نہیں لیتا جب تک کہ وہ قوم اپنے عمل اور کردار سے خود نہیں بدلتی۔

آئیے اب ہم ایک نظر انسان پر بھی ڈال لیں۔

اس کی ہستی کا اگر تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ اپنے اندر دو مختلف حیثیتیں رکھتا ہے۔ جو اپنی اپنی خصوصیات کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف بھی ہیں مگر باہم دگر ملی جلی بھی۔

ایک حیثیت سے وہ ایک حیوان ہے اور اس وجہ سے اس پر وہی قوانین فرمانروائی کرتے ہیں جو تمام طبیعیات و حیوانات پر نافذ ہوتے ہیں۔ اس لیے انسان کے وجود کی کارکردگی منحصر ہے ان آلات و وسائل پر، ان مادی ذرائع پر، اور ان طبعی حالات پر جن پر دوسری تمام طبعی اور حیوانی موجودات کی کارکردگی کا انحصار ہے۔ یہ پیکرِ انسانی جو کچھ کر سکتا ہے انہیں قوانینِ طبعی کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پابندی کے ذریعہ، آلات و وسائل کی مدد سے اور طبعی حالات کے اندر ہی رہتے ہوئے کر سکتا ہے اور اس کے کام پر عالمِ اسباب کی تمام قوتیں مخالف یا موافق اثر ڈالتی ہیں۔

اُس کی دوسری حیثیت جس کی وجہ سے اُسے اشرف المخلوقات کہا گیا ہے، اُسکی حیوانی حیثیت نہیں بلکہ اُس کی اخلاقی حیثیت ہے اور اس حیثیت سے وہ طبیعات کا تابع نہیں بلکہ اُن پر ایک طرح سے حکومت کرتا ہے اور اپنے طبعی و حیوانی وجود کو آلۂ کار کے طور پر استعمال کرتا ہے۔

انسان کے اندر ان دونوں قوتوں کو جمع کر دیا گیا ہے۔ ایک طرف اُس کے حیوانی داعیات ہیں، اور دوسری طرف اخلاقی احساسات۔ مجموعی حیثیت سے اُس کی کامیابی کا راز مادی اور اخلاقی دونوں قسم کی قوتوں پر ہے۔ اُسے عروج ہوتا ہے تو دونوں کی مدد سے، اور اگر وہ گرتا ہے تو اُسی وقت گرتا ہے جب یہ دونوں طاقتیں اُس کے ہاتھ سے چھن جاتی ہیں یا اس میں وہ دوسروں کی بہ نسبت کمزور ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر حالات کا بہ نظرِ غائر مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ قوموں کے عروج و زوال میں اصل اور فیصلہ کن قوت صرف اخلاقی قوت ہے۔ باقی رہے مادی وسائل اور اسباب، تو اُن کی حیثیت آلۂ کار کی سی ہے۔ انسانی عظمت صرف اس وجہ سے نہیں کہ وہ چند دھاتوں کا مجموعہ ہے، یا اُس میں چلنے پھرنے کی قوتیں موجود ہیں بلکہ اُس کی وہ امتیازی خصوصیت جس کی وجہ سے اُسے خلیفہ منتخب کیا گیا ہے، اخلاقی ذمہ داری کا حامل ہونا ہے۔ لہٰذا جب انسانیت کا جوہر صرف اخلاق ہی ہے تو لامحالہ انسانیت کی ترقی اور تنزل میں اخلاقیات کو ہی انسانی زندگی کے بناؤ اور بگاڑ میں فیصلہ کن مقام حاصل ہے[1]۔ اس لیے اگر اسلامی فلسفۂ تاریخ کو تاریخ کی اخلاقی تعبیر کا نام دے دیا جائے تو یہ غیر موزوں نہ ہو گا۔

اس سلسلہ میں ہم ایک اور ضروری بات جو کہنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ مغربی اقوام کی ہوش رُبا مادی ترقی نے بعض ذہنوں کو یہاں تک متاثر کیا ہے کہ اُن کی نظر سے قانونِ طبعی (Physical law) اور قانونِ شرعی (Moral law) کا فرق یکسر اوجھل ہو گیا ہے۔

---

[1] سید ابوالاعلیٰ مودودی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ان کے نزدیک عبادتِ الٰہی محض قانونِ طبعی کی پیروی کا نام ہے قطع نظر اس کے کہ وہ قانونِ شرعی کے مطابق ہو یا نہ ہو۔ اس بنا پر وہ ان لوگوں کو بھی خدا کے عبادت گزار بندے قرار دیتے ہیں جو قانونِ طبیعی کو کام میں لاکر ایجادات و اکتشافات کے میدانوں میں دنیا کی دوسری اقوام سے آگے نکل جائیں۔ اگرچہ وہ ان کے استعمال میں خداوند تعالیٰ کے قانونِ اخلاق کے بالکل پابند نہ ہوں۔ اسی قسم کا ایک نظریہ ایک بزرگ نے یوں پیش کیا ہے:-

"آج دنیا میں وہی قوم بلندی، آزادی اور عزت حاصل کر سکتی ہے جو صحیح معنوں میں فیض رساں اور خادمِ خلق ہو۔ جو مخازن و معادن کو استعمال میں لاکر رفاہ عامہ کے لیے گاڑیاں چلائے، دریاؤں پر پل باندھے، نہروں اور سڑکوں کا جال پھیلائے، سمندر کی طغیانیاں مسخر کرکے انہیں تجارت کے قابل بنائے جن کی تلاش و جستجو سے ایک عالم فائدہ اٹھائے، جو آبشاروں سے بجلی پیدا کرکے دنیا کو روشنی اور طاقت عطا کرے جو کوئلے اور پٹرول کا صحیح استعمال جانتی ہو اور جس کے فولادی اسلحہ اعدائے انسانیت کے لیے تباہی و ہلاکت کا پیام ہوں"

اس کے بعد امر بالمعروف کی تشریح فرماتے ہوئے کہتے ہیں:-

"قرآن میں ہمیں آمر بالمعروف کا لقب دیا گیا ہے۔ معروف یہی ہے کہ ہم کائنات کے اسلحہ خانہ سے قوت و ہیبت کا وہ سامان پیدا کریں کہ شیطان کا چراغ ہمیشہ کے لیے گل ہو جائے"

قرآنِ پاک کی یہ تفسیر اس کی حقیقی روح کے یکسر منافی ہے۔ اس کے تو دنیا میں آنے کا مقصد ہی یہی ہے کہ انسان کو یہ بتائے کہ وہ "اندر کے میدان" پر کس طرح غلبہ حاصل کر سکتا ہے۔ اگر قرآن حکیم کا مدعا صرف یہ ہے کہ وہ انسانوں کو ہوائی جہاز اور بم بنانے کی تلقین کرے تو اس لحاظ سے مغربی اقوام مسلمانوں کی بہ نسبت زیادہ مومن اور صالح ہیں۔ اسلامی تعلیمات کا ایسے گمراہ کن نظریات سے قطعاً کوئی تعلق نہیں۔ اگر انسان کو محض قانونِ طبیعی کی پیروی کے لیے پیدا کیا جاتا تو پھر کسی نبی اور کسی کتاب کی ضرورت نہ تھی، اس کے لیے صرف حیوانی جبلت ہی کافی تھی جو سارے زندگی میں اس کی رہنمائی کرتی۔ جس طرح ایک بھیڑیے کا بکریوں کو کھا جانا عین قانونِ طبیعی کی پیروی ہے اسی طرح ظالم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اقوام یا جماعتوں کا کمزور دل پر ظلم وستم ڈھانا بھی عین فطرت ہے۔ اس بنا پر ہر قسم کا جور وجفا اور لوٹ کھسوٹ نہ صرف جائز ہے بلکہ عین انصاف ہے۔ اس نظریہ کو تسلیم کر لینے کے بعد انسان اور موذی جانوروں میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ لہٰذا انسانیت نے آج تک جو لڑائی حق اور انصاف کے لیے لڑی ہے وہ سب بیکار اور غلط ہے۔ اسلام اس فلسفہ کی پورے زور سے تردید کرتا ہے اس کی تو بنیادی تعلیم ہی یہی ہے کہ انسان کی طبعی زندگی کو قانونِ شرعی کے مطابق ڈھالا جائے اور اسے اخلاق کی ان معروضی قدروں (Objective Values) کا پابند بنایا جائے جو خدا تعالیٰ نے اپنے انبیاء کے ذریعہ سے اہلِ دنیا تک پہنچائیں۔

پھر اس نظریہ کے حامی ایک ضروری بات جو بھول جاتے ہیں وہ یہ ہے کہ اگر عروج نام ہی مادی غلبہ کا ہے اور زوال مادی اسباب کی کمی ہے تو اس لحاظ سے یہ کہنا کہ مادی طاقت عروج کا باعث ہوتی ہے یکسر غلط ہے۔ اس میں ایک فکری تضاد پایا جاتا ہے اس دعویٰ کے دوسرے معنی یہ ہوئے کہ کسی قوم کا مادی غلبہ اس کے مادی غلبہ ہی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ یہ استدلال نہایت ہی مہمل اور بے معنی ہے۔

بالفرض اگر چند لمحوں کے لیے یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ کسی قوم کی ترقی کرتے رہنے کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ مادی اعتبار سے مضبوط ہو اور اس کے ذلیل وخوار رہنے کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ بے سروسامان ہو تو پھر آج تک کی ساری تاریخ غلط ہو جاتی ہے۔ اس اصول کے مطابق اگر ایک قوم کو دنیا میں ترقی حاصل ہو جائے تو پھر اسے اسی مقام پر رہنا چاہیے کیونکہ اس مادی طاقت کی وجہ سے وہ مزید دولت سمیٹ سکتی ہے اور دوسری قوموں کو ہمیشہ کے لیے مغلوب رکھ سکتی ہے لیکن تاریخ کے اوراق اس حقیقت کے شاہد ہیں کہ ایسا نہیں ہوا۔ ایک قوم یکایک گمنامی سے نکل کر میدانِ عمل میں آتی ہے۔ طاقت اور ثروت کو غلام بنا کر دنیا پر چھا جاتی ہے۔ پھر یکایک کارزارِ حیات میں وہ پسپا ہونا شروع ہوتی ہے، اس کی طاقت کم ہو جاتی ہے، اس کی دھاک دلوں سے اٹھنے لگتی ہے اور تاریخ کے وہی اوراق جنہوں نے کبھی اس کا خیر مقدم کیا تھا وہ اس کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مدفن بھی بنتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ آخر وہ کونسی طاقت ایسی ہے جو ایک قوم کو مادی وسائل کے صحیح طور پر استعمال کرنے پر اُبھارتی ہے اور جس کے ختم ہوتے ہی یہی مادی اسباب اس کے لیے وبالِ جان بن جاتے ہیں۔ یہ قوت اخلاق کی قوت ہے۔ اس بات کو جسم اور روح پر قیاس کر لیجیے۔ قوموں کی زندگی میں مال و اسباب جسم کی حیثیت رکھتے ہیں اور اخلاقی قوت بمنزلہ روح کے ہوتی ہے۔ کوئی صاحب عقل جسم کی اہمیت سے انکار نہیں کر سکتا۔ مگر اصل چیز جو اس جسم کو جان عطا کر کے اسے سرگرم عمل کرتی ہے وہ انسان کی روح ہے۔ روح کا جسم سے رشتہ منقطع ہوتے ہی جسم بیکار ہو جاتا ہے اور کچھ وقت گزرنے کے بعد اس سے بدبو آنے لگتی ہے یہی حال قوموں کا ہے۔ ان کی زندگی میں مادی ذرائع اور وسائل کافی اہمیت رکھتے ہیں مگر ان کی حیثیت ہے بہرحال ذرائع ہی کی۔ اصل قوت جو ان ذرائع کو استعمال میں لاتی ہے وہ اخلاقی قوت ہے اور اگر یہ قوت ناپید ہو تو یہی مادی اسباب اکثر اوقات اُس کی تباہی کا باعث بنتے ہیں۔

اخلاق کی اس قوت کو دو حصوں میں منقسم کیا جا سکتا ہے۔ ایک بنیادی انسانی اخلاقیات اور دوسرے اسلامی اخلاقیات۔ بنیادی انسانی اخلاق سے ہماری مراد وہ اوصاف ہیں جن پر انسان کے اخلاقی وجود کی اساس قائم ہے اور اُن میں وہ تمام صفات شامل ہیں جو دنیا میں انسان کی کامیابی کے لیے بہرحال شرطِ لازم ہیں۔ خواہ وہ صحیح مقصد کے لیے کام کر رہا ہو یا غلط مقصد کے لیے۔ ان اخلاقیات میں اس امر کی کوئی تخصیص نہیں کہ افراد یا قومیں خداوند تعالیٰ کو مانتی ہیں یا نہیں، اُن کا آخرت پر ایمان ہے یا نہیں، وہ وحی پر یقین رکھتی ہیں یا نہیں۔ اگر وہ ان اخلاقیات کو اپنا لیتی ہیں تو وہ زندگی کی اس تگ و دو میں بہرحال کامیاب ہونگی۔ یہاں اس بات کا سرے سے سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ ان کے عزائم اچھے ہیں یا برے، اُن کے ہاں طہارتِ نفس اور نیت خیر کی متاع ہے یا نہیں۔ جو شخص اور جو گروہ بھی اپنے اندر ان اوصاف کو پیدا کریگا وہ دنیا میں یقیناً کامیاب ہوگا اور اُن لوگوں سے بازی لے جائے گا جو ان اوصاف کے لحاظ سے اس کے مقابلہ میں ناقص ہونگے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

"اسلامی اخلاقیات بنیادی انسانی اخلاقیات سے کوئی الگ چیز نہیں بلکہ اسی کی تصحیح اور تکمیل ہے۔ اسلام کا پہلا کام یہی ہے کہ وہ بنیادی انسانی اخلاقیات کو ایک صحیح مرکز اور محور مہیا کر دیتا ہے۔ جس سے وابستہ ہو کر وہ سراپا خیر بن جاتے ہیں۔ اپنی ابتدائی صورت میں تو یہ اخلاقیات مجرد ایک قوت ہیں جو خیر بھی ہو سکتی ہیں اور شر بھی ... اُن کا کسی شخص یا گروہ میں ہونا بجائے خود خیر نہیں بلکہ اس کا خیر ہونا موقوف ہے اس امر پر کہ یہ قوت صحیح راہ میں صرف ہو اور اس کو صحیح راہ پر لگانے کی خدمت صرف اسلام ہی انجام دے سکتا ہے"۔[1] لہٰذا ایک فرد یا گروہ کی حقیقی سربلندی تو یہی ہے کہ وہ دینِ حق کا پورے شعور کے ساتھ پیرو ہو۔ وہ سوچ سمجھ کر ہادیٔ برحق صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات پر ایمان لائے اور اُس پر عمل بھی کرے۔ اس لیے جب ہم بنیادی انسانی اخلاقیات کا تذکرہ کرتے ہیں تو ان سے ہمارا مقصد صرف اُن قدروں کا تعین ہے جو صرف اس دنیا میں انسان کو سربلندی عطا کرتی ہیں۔ باقی رہی آخرت کی نجات تو وہ صرف قبولِ اسلام ہی میں ہے۔

یہ انسانی اخلاقیات دراصل وہ عالمگیر حقیقتیں ہیں جن کو سب انسان جانتے چلے آرہے ہیں۔ یہ کوئی ڈھکی چھپی چیزیں نہیں کہ انہیں کہیں سے ڈھونڈ کر نکالنے کی ضرورت ہو۔ وہ انسانیت کی جانی پہچانی متاع ہے جس کا شعور اُس کی فطرت میں شروع سے ہی ودیعت کر دیا گیا ہے۔

اس سلسلہ میں اس امر کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ کسی قوم کے چند نفوس کا ان اخلاقی بنیادی صفات کو اپنا لینا اُس کو ترقی کی راہ پر نہیں لے جا سکتا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ قوم کے زیادہ سے زیادہ افراد میں یہ صفات پائی جائیں۔ یوں تو دنیا کی شاید ہی کوئی قوم ایسی ہوگی جس کے چند افراد میں بھی یہ صفات نہ ملتی ہوں مگر عظمت اور سربلندی صرف اُس کو نصیب ہوتی ہے جس کی عظیم اکثریت ان سے متصف ہو۔ آئیے اب ہم اُن صفات کا جائزہ لیں جن کو جب کوئی قوم اپنے اندر پیدا کر لیتی ہے تو کامیاب ہو جاتی ہے۔

قومی عروج و ترقی اور اجتماعی کامیابیوں کے اسباب کا اگر تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ مقصد کا

---

[1] ماخوذ از تحریکِ اسلامی کی اخلاقی بنیادیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

شعور اور نصب العین کا عشق ہی وہ اصلی قوت ہے جو اقوام کو کامیابی اور عظمت کی راہ پر لگاتی ہے۔ جماعت ہو یا فرد، مقصد کی مقناطیسی کشش ہی اس کی جد وجہد کا اصلی محرک ہے۔ مقصد سے وابستگی زندگی ہے اور اس سے بے رغبتی موت۔ نصب العین کا عشق ہی ایک ایسا عشق ہے جو جماعتوں اور افراد کی خفتہ قوتوں کو بیدار کرتا ہے، اُن کے مختلف اجزا کو باہم جوڑتا ہے اور پھر اُن میں ترتیب اور تنظیم پیدا کرتا ہے۔ آپ جہاں بھی دیکھیں گے یہی پائیں گے کہ مقصد اور نصب العین کی محبت نے ہی اقوام وملل کو سرگرمِ عمل کیا۔ دنیا میں آج تک کوئی قوم ایسی دیکھنے میں نہیں آئی جو زندہ بھی ہو اور نصب العین کی محبت سے خالی ہو۔ جس قوم کے افراد اس صفت سے خالی ہونگے اُن کا ترقی کرنا تو ایک طرف زندہ رہنا بھی محال ہے۔ جس جماعت کے ہاں کسی منزلِ مقصود تک پہنچنے کی تڑپ نہ ہو، انہیں دوسرے لوگ بڑی ہی آسانی سے اپنی اغراض ومفادات کا تابع بنا لیتے ہیں۔ حیاتِ قومی کی سب سے بڑی نشانی یہ ہے کہ ایک قوم اُن اصولوں کی خاطر جنہیں وہ اپنا سمجھتی ہے بڑی سے بڑی قربانی دینے سے گریز نہ کرے۔ اور یہ جذبۂ ایثار اسی نسبت سے بڑھتا ہے جس نسبت سے نصب العین کے ساتھ اسکے عشق میں ترقی ہوتی ہے۔ پھر اس قوم کی تمام کوششیں ایک قطب نما سوئی کی طرح نہایت ہی فطری انداز میں اسی ایک مقصد کے گرد گردش کرنے لگتی ہیں۔ دو رنگی اور تذبذب انفرادی زندگی میں بھی مہلک امراض ہیں مگر اجتماعی زندگی میں ان کی تباہ کاریاں بالکل ناقابلِ بیان ہیں۔ زندہ قومیں کسی آئیڈیل کو اپنا لینے پر اس کی روح کو اپنے پورے سسٹم میں متحرک کر لیتی ہیں پھر اُن کی زندگی کا کوئی مخفی سے مخفی گوشہ، قلب ودماغ کا کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ ریشہ بھی ایسا نہیں رہتا جو اس کے اثر سے محفوظ ہو۔ اس کے برعکس ایک دم توڑتی ہوئی قوم کی سب سے بڑی نشانی یہ ہے کہ وہ اپنے نصب العین کے لیے زندہ رہنے کا سبق بھول جاتی ہے۔ یہ ایک ایسی بدیہی حقیقت ہے جس کے لیے کسی ورق گردانی کی ضرورت نہیں۔ دورِ جدید کی مغربی اقوام نے چند خلافِ فطرت اور خلافِ عقل مقاصد کو اپنا کر دنیا میں ترقی حاصل کی۔ اس کی وجہ اس کے علاوہ اور کیا ہے کہ اگرچہ ان کے مقاصد باطل ہیں مگر اُن کی طلب صادق ہے اور اُن کے عزائم راسخ۔ وہ زندگی کے تمام مسائل کو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اپنے نصب العین کی روشنی میں دیکھتی ہیں اور پھر اسی کے مطابق ہی انہیں حل کرتی ہیں۔

نصب العین سے محبت کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ قوم میں قوت عمل بڑھتی ہے، اس میں زندگی کے بھید کھلنا شروع ہوتے ہیں۔ ذہن اپنی ساری قوتوں کو مجتمع کرکے جسم کو ارادہ اور احساس کے سہارے آگے بڑھائے جاتا ہے اور نئے نئے تجربوں سے زندگی میں توسیع و استحکام پیدا کرتا ہے۔ قومیں اپنی تعمیر پیہم عمل سے ہی کرتی ہیں۔ اور یہ عمل ہی کا کرشمہ ہے کہ قوم کے اندر ارادے کی طاقت اور فیصلے کی قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ عزم اور حوصلے سے، صبر سے اور استقلال سے حکمت اور شجاعت سے کام لینا سیکھتی ہے۔ پھر اس میں حزم و احتیاط اور معاملہ فہمی و تدبر ایسی بلند صفات ابھرتی ہیں۔ نصب العین کا عشق اس کے افراد کو ذاتی اغراض و منافع کی پرستش سے بلند کر دیتا ہے اور ان میں یہ احساس زندہ کرتا ہے کہ ان کا شخصی مفاد دوسروں کے مقابلہ میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ اس احساس کا ناگزیر اثر یہ ہوتا ہے کہ ان کے اندر شریفانہ خصائل ترقی کرتے ہیں۔ مثلاً خودداری، فیاضی، رحم، ہمدردی، انصاف، وسعتِ قلب و نظر، سچائی، امانت، راستبازی، پاسِ عہد، معقولیت، اعتدال، شائستگی، طہارت و نظافت اور ذہن و نفس کا انضباط۔ ان صفات پر اگر غور کیا جائے گا تو معلوم ہوگا کہ یہ ساری خوبیاں دراصل اس وقت پیدا ہوتی ہیں جب کوئی شخص اپنے نفس کو زیر کرکے دوسرے کے رنج و راحت کو اپنی ذاتی آسایش اور آرام پر ترجیح دینے لگتا ہے، اور محض گلیمِ خویش کو بچا لے جانے کی فکر میں نہیں رہتا، بلکہ دوسرے ڈوبتوں کو نکالنے کے لیے جدوجہد کرنا اپنا فرضِ منصبی سمجھتا ہے۔ یہ سب خوبیاں کسی بلند نصب العین کا عشق ہی پیدا کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک نے اچھے اور برے اعمال کو پانی اور جھاگ سے تعبیر کیا ہے۔ ایک جو نافع ہیں اور دوسرے ضائع ہونے والے۔

أَنزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَسَالَتْ أَوْدِيَةٌ	اللہ نے آسمان سے پانی برسایا اور ہر ندی نالہ اپنے
بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَّابِيًا وَ	ظرف کے مطابق اسے لے کر چل نکلا، پھر جب سیلاب
مِمَّا يُوقِدُونَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ ابْتِغَاءَ حِلْيَةٍ أَوْ	اٹھا تو سطح پر جھاگ بھی آگئے اور ایسے ہی جھاگ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُهٗ ؕ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ ؕ فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً ۚ وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ ؕ (۱۳ : ۱۷)

اُن چیزوں پر بھی اُٹھتے ہیں جنہیں زیور اور برتن وغیرہ بنانے کے لیے لوگ پگھلایا کرتے ہیں۔ اس مثال سے اللہ حق اور باطل کے معاملے کو واضح کرتا ہے جو جھاگ ہے وہ اُڑ جایا کرتا ہے اور جو چیز انسانوں کے لیے نافع ہے وہ زمین میں ٹھہر جاتی ہے۔

قرآن حکیم نے اِن آیات میں کنایۃً یہ بتا دیا ہے کہ وہی قومیں دنیا میں باقی رہتی ہیں جن کے اعمال سے نوعِ انسانی کو فائدہ پہنچے اور جن کا وجود نفعِ خلائق کا موجب ہو۔ ایسی اقوام وہی ہو سکتی ہیں جن کے دل میں انسانیت کا احترام دوسروں کی نسبت زیادہ ہو۔ جن کے دل کے تار اس قدر حساس ہوں کہ نوعِ انسانی کا معمولی دُکھ درد بھی اُن کے اندر ارتعاش پیدا کر دے۔ جن کے ہاں ایثار اور بے نفسی کی نعمت پائی جائے۔ جس قوم کے افراد ذاتی منفعت اور گھٹیا قسم کی خواہشات کے لیے جیتے ہوں اُن سے انسانیت کی فلاح و بہبود کی توقع رکھنا انتہائی غیر دانشمندی ہے۔ قرآن کا نظریۂ فضیلت ہمیں سکھاتا ہے کہ افراد و اقوام کا ایک دوسرے پر تفوق استحصال اور ظلم کے لیے نہیں ہے بلکہ اس لیے ہے تاکہ برتر اور فائق لوگ کمتر اور کمزوروں کی خدمت کریں اور اس طرح انہیں بھی اپنی سطح تک بلند کر لیں۔ ظالم اور عیش پرست افراد یا جماعتیں اپنے ذاتی عیش کی خاطر کمزوروں کو لوٹتی ہیں اور اس طرح انسانیت کی سطح بلند کرنے کی بجائے وہ اسے تنزل کی طرف لے جاتی ہیں۔ قدرت اُن کے وجود کو کچھ دیر کے لیے برداشت تو کرتی ہے تاکہ انہیں اصلاح کا موقع دے مگر جب وہ اپنی اس روش سے باز نہیں آتیں تو انہیں دنیا میں تباہ و برباد کر دیا جاتا ہے۔

وَمَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرٰٓى اِلَّا وَاَهْلُهَا ظٰلِمُوْنَ ۔

ہم کسی آبادی (قوم) کو ہلاک نہیں کرتے بجز اس کے کہ اس کے افراد ظالم ہوں۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ ان قوموں کو دنیا کی کون کون سی چیزیں ظالم بناتی ہیں:

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ

لوگوں کے لیے زینت رکھی گئی ہے، عورتوں، بیٹوں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

النِّسَاءِ وَالْبَنِينَ وَالْقَنَاطِيرِ الْمُقَنطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْأَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ۗ ذَٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۖ وَاللَّهُ عِندَهُ حُسْنُ الْمَآبِ۔

اور چاندی سونے کے اکٹھے کیے ہوئے ڈھیر، اور نشان کیے ہوئے گھوڑوں، چوپایوں اور کھیتیوں کی محبت میں۔ یہ تو دنیوی زندگی کی متاع ہے اور اللہ کے یہاں اس سے بہتر پناہ گاہ ہے۔

قرآن حکیم کے انداز بیان سے پتہ چلتا ہے کہ فساد کی اصل جڑ انسان کی یہ تملیکی ذہنیت (acquisitive mentality) ہے۔ جو اسے شہوت رانی، لذت طلبی، عیش پرستی، حصولِ دولت اور زینت و تفاخر کے اسباب جمع کرنے میں مشغول رکھتی ہے اور اس کے اندر احساس کو فنا کر دیتی ہے کہ وہ ابنائے نوع کے لیے بھی کوشش کرے۔ یہ خود غرضی مختلف شکلوں میں نمودار ہوتی ہے۔ مثلاً معاشی استحصال میں، بے حیائی اور بے غیرتی میں، اور کام و دہن کی لذت میں۔ یہ بیماری نہ صرف چند لوگوں کی ذہنیت اور اخلاق کو بگاڑتی ہے بلکہ قوم کے دیگر افراد بھی اس سے تباہ و برباد ہوتے ہیں۔ اور انحطاط کی انتہا یہ ہوتی ہے کہ پوری قوم کے اندر "احساسِ زیاں" بالکل ختم ہو جاتا ہے۔ قرآن حکیم نے مختلف اقوام کی تباہی کا ذکر جس طریقہ سے کیا ہے وہ اس حقیقت کا آئینہ دار ہے کہ بربادی کا اصلی سبب "احساس کا فقدان" تھا۔ چنانچہ بنی اسرائیل کو ذلت و مسکنت اور غضب و لعنتِ الٰہی میں مبتلا اس وقت کیا گیا جب کہ ان کے ہاں اخلاقی پستی اس حد تک پہنچ گئی تھی کہ ان کے بڑے بڑے نیک آدمی بھی امراء کے اعمالِ بد پہ گرفت نہ کرتے تھے۔

تَرَىٰ كَثِيرًا مِّنْهُمْ يُسَارِعُونَ فِي الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَأَكْلِهِمُ السُّحْتَ ۚ لَبِئْسَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۔ لَوْلَا يَنْهَاهُمُ الرَّبَّانِيُّونَ وَالْأَحْبَارُ عَن قَوْلِهِمُ الْإِثْمَ وَأَكْلِهِمُ السُّحْتَ ۚ لَبِئْسَ مَا كَانُوا يَصْنَعُونَ (المائدہ-۹)

تو ان میں سے اکثر کو دیکھتا ہے کہ گناہ اور حدود الٰہی سے تجاوز اور حرام خوری کی طرف لپکتے ہیں۔ یہ کیسی بری حرکتیں تھیں جو وہ کرتے تھے۔ کیوں نہ ان کے مشائخ اور علماء نے ان کو بری باتیں کہنے اور حرام کے مال کھانے سے منع کیا؟ یہ بہت برا تھا جو وہ کرتے تھے۔

لُعِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِن بَنِي إِسْرَائِيلَ

بنی اسرائیل میں سے جن لوگوں نے کفر کیا ان پہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عَلٰی لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِیْسَی ابْنِ مَرْیَمَ۔ — داؤد اور عیسیٰ بن مریم کی زبان سے لعنت کرائی گئی۔ اس

ذٰلِکَ بِمَا عَصَوْا وَّکَانُوْا یَعْتَدُوْنَ۔ کَانُوْا — لیے کہ انہوں نے سرکشی کی اور وہ حد سے گزر جاتے تھے

لَا یَتَنَاھَوْنَ عَنْ مُّنْکَرٍ فَعَلُوْہُ — وہ ایک دوسرے کو برے افعال سے نہ روکتے تھے۔

اس آخری آیت کی تفسیر میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے جو احادیث منقول ہیں وہ قرآن حکیم کے مقصد کو اور زیادہ واضح کر دیتی ہیں۔ سب روایات کا خلاصہ یہ ہے کہ حضور نے فرمایا:۔

"بنی اسرائیل میں جب بدکاری پھیلنی شروع ہوئی تو حال یہ تھا کہ ایک شخص اپنے بھائی، دوست یا ہمسایہ کو برا کام کرتے دیکھتا تو اس کو منع کرتا کہ اے شخص خدا کا خوف کر۔ مگر اس کے بعد وہ اسی شخص کے ساتھ گھل مل کر بیٹھتا اور یہ بدی کا مشاہدہ اس کو اس بدکار شخص کے ساتھ میل جول اور کھانے پینے میں شرکت کرنے سے نہ روکتا۔ جب ان کا یہ حال ہو گیا تو ان کے دلوں پر ایک دوسرے کا اثر پڑ گیا اور اللہ نے سب کو ایک رنگ میں رنگ دیا اور ان کے نبی داؤد اور عیسیٰ بن مریم کی زبان سے ان پر لعنت کی۔"

راوی کہتا ہے کہ جب حضور سلسلۂ تقریر میں اس مقام پر پہنچے تو جوش میں آ کر اٹھ بیٹھے اور فرمایا:۔

"قسم ہے اس ذات پاک کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے تم پر لازم ہے کہ نیکی کا حکم کرو اور بدی سے روکو اور جس کو برا فعل کرتے دیکھو اس کا ہاتھ پکڑ لو اور اُسے راہ راست کی طرف موڑ دو اور اس معاملہ میں ہرگز رواداری نہ برتو۔ ورنہ اللہ تمہارے دلوں پر بھی ایک دوسرے کا اثر ڈال دے گا اور تم پر بھی اسی طرح لعنت کرے گا جس طرح بنی اسرائیل پر کی۔"

یہ حدیث بتاتی ہے کہ قوم پر تباہی اُس وقت آتی ہے جب پوری کی پوری قوم مفاسد کا شکار ہو جاتی ہے اور اُس قوم کے نیک لوگ بھی برائیوں سے سمجھوتہ کرنے میں کوئی حرج محسوس نہیں کرتے۔ فسق و فجور کے ساتھ مفاہمت کی بڑی وجہ افراد میں طفیلی ذہنیت کا پیدا ہونا ہے۔

وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِیْبَنَّ الَّذِیْنَ — بچو اس فتنے سے جو صرف انہی لوگوں کو مبتلائے مصیبت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ظَلَمُوا مِنكُمْ خَاصَّةً ۔ ذکرے گا جنہوں نے تم میں سے ظلم کیا

ابن عباس رضی اللہ عنہ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا منشا اس سے یہ ہے کہ بدی کو اپنے سامنے نہ ٹھیرنے دو، کیونکہ اگر تم بدی سے رواداری کروگے اور اس کو پھیلنے دوگے تو اللہ کی طرف سے تم پر عذاب نازل ہوگا اور اس کی لپیٹ میں اچھے اور برے سب آجائیں گے۔ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کی تشریح اس طرح فرمائی ہے:۔

ان اللہ لا یعذب العامۃ بعمل خاصۃ حتی یروا المنکر بین ظھرانیھم وھم قادرون علی ان ینکروہ فلا ینکرون فاذا فعلوا ذالک عذب اللہ الخاصۃ والعامۃ۔	اللہ خاص لوگوں کے عمل پر عام لوگوں کو عذاب نہیں دیتا۔ مگر جب وہ اپنے سامنے بدی کو دیکھیں اور اس کو روکنے کی قدرت رکھنے کے باوجود اس کو نہ روکیں تو اللہ خاص اور عام سب کو مبتلائے عذاب کر دیتا ہے۔

لہٰذا کسی قوم کی بربادی کی اصل وجہ ذلیل مقاصد کی طلب ہے۔ یہ ذلیل خواہشیں انسان کے اندر تخلیقی قوتوں کو بالکل نیست و نابود کر دیتی ہیں۔ جو لوگ ان کو پورا کرنے کے لیے ہر وقت دوڑ دھوپ کرتے رہتے ہیں وہ اخلاقی لحاظ سے نہایت ہی پست سطح پر آجاتے ہیں۔ اس کے علاوہ جن لوگوں سے یہ مقاصد پورے کیے جاتے ہیں اُن کی ذہنیت بھی بگڑ جاتی ہے اُن کے اندر وہ جرأتِ ایمانی ختم ہو جاتی ہے جس کو کام میں لا کر وہ ان برائیوں کو روک سکیں۔ وہ اپنے اندر تحریص و ترغیب کی یورش کا مقابلہ کرنے کی ہمت نہیں پاتے اور اپنے آپ کو فسق و فجور کے اس سیلاب میں کھو بیٹھتے ہیں۔ اس وقت خدا انہیں اُن کی بداعمالیوں کی وجہ سے پکڑ لیتا ہے:۔

وَإِذَا أَرَدْنَا أَن نُّهْلِكَ قَرْيَةً أَمَرْنَا مُتْرَفِيهَا فَفَسَقُوا فِيهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنَاهَا تَدْمِيرًا ۔	اور جب ہم کسی آبادی کو برباد کرنا چاہتے ہیں تو اس کے دولتمندوں کی تعداد میں اضافہ کر دیتے ہیں اس لیے وہ فسق و فجور میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور اب اُس پر ہمارا قانونِ فطری منطبق ہو جاتا ہے
(بنی اسرائیل)	

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور ہم اس کو تباہ کر دیتے ہیں۔

علامہ ابنِ خلدون نے مذکورہ بالا آیت کو اصل قرار دے کر زوالِ تمدن پر جو جامع اور مفصل فلسفیانہ مضمون لکھا ہے اُس کا خلاصہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

"جب شہری لوگوں کو دولت و ثروت مل جاتی ہے تو وہ فطرۃً ان کو تمدنی ساز و سامان کی طرف مائل کر دیتی ہے۔ اس لیے اُن کے کھانے پینے، رہنے سہنے، پہننے اوڑھنے کی تمام چیزوں میں رنگینی اور راحت پیدا ہو جاتی ہے اور جب رنگین مزاجی اس درجہ کو پہنچ جاتی ہے تو انسان شہوانی خواہشوں کا غلام ہو کر دین و دنیا دونوں سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اس وقت لوگوں کے مصارف میں اضافہ ہو جاتا ہے اور چونکہ سلطنت کے عین شباب کے زمانے میں تمدن اپنی انتہائی ترقی کو پہنچ جاتا ہے اور ہر سلطنت میں ٹیکس لگانے کا یہی زمانہ ہوتا ہے کیونکہ اس وقت سلطنت کے اخراجات بڑھ جاتے ہیں اور ٹیکس کا تمامتر بار تجارت پر پڑتا ہے۔ کیونکہ تجارت پیشہ لوگ جو کچھ صرف کرتے ہیں اس کو اسباب تجارت ہی سے وصول کرتے ہیں اس لیے ٹیکس اشیاء کی اصل قیمت کا جزو ہو جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ متمدن لوگوں کے اخراجات بہت زیادہ بڑھ جاتے ہیں اور اُن کی تمام آمدنی انہی مصارف میں صرف ہو جاتی ہے اور وہ مفلس اور محتاج ہو جاتے ہیں۔"

حکیم الامت شاہ ولی اللہ دہلوی نے بھی اپنی مشہور کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں اس مسئلہ کو نہایت تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:-

"جب پارسیوں اور رومیوں کو حکومت کرتے صدیاں گذر گئیں اور دنیوی تعیش کو انہوں نے اپنی زندگی بنا لیا اور آخرت کو بھلا دیا اور شیطان نے اُن پر غلبہ کر لیا تو اب اُن کی تمام زندگی کا حاصل یہ بن گیا کہ وہ عیش پسندی کے اسباب میں منہمک ہو گئے اور ان میں کا ہر شخص سرمایہ داری اور تمول پر فخر کرنے اور اترانے لگا۔ یہ دیکھ کر دنیا کے مختلف گوشوں سے وہاں ایسے ماہرین جمع ہو گئے جو بجا عیش پسندوں کو داد عیش دینے کے لیے عیش پسندی کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نئے طریقے ایجاد کرنے اور سامانِ عیش مہیا کرنے کے لیے عجیب و غریب وقیقہ سنجیوں اور نکتہ آفرینیوں میں مصروف نظر آنے لگے اور قوم کے اکابر اس جد و جہد میں مشغول نظر آنے لگے کہ اسبابِ تعیش میں کس طرح وہ دوسروں پر فائق ہو سکتے اور ایک دوسرے پر فخر و مباہات کر سکتے ہیں حتیٰ کہ ان کے امرا اور سرمایہ داروں کے لیے یہ سخت عیب اور عار سمجھا جانے لگا کہ ان کی کمر کا پٹکہ یا سر کا تاج ایک لاکھ درہم سے کم قیمت کا ہو، یا اُن کے پاس عالیشان سر بفلک محل نہ ہو جس میں پانی کے حوض، سرد و گرم حمام بے نظیر پائیں باغ ہوں اور ضرورت سے زائد نمائش کے لیے بیش قیمت سواریاں، خشم و خدم اور حسین و جمیل باندیاں موجود ہوں، اور صبح و شام رقص و سرود کی محفلیں گرم ہوں اور جام و سبو سے شراب ارغوانی چھلک رہی ہو اور فضول عیاشی کے وہ سب سامان مہیا ہوں جو آج بھی تم عیش پسند بادشاہوں اور حکمرانوں میں دیکھتے ہو۔ اور جس کا ذکر قصہ طولانی کے مترادف ہے ۔۔۔

اس کا نتیجہ یہ تھا کہ مملکت کی اکثریت کی یہ حالت تھی کہ دلوں کا امن و سکون مٹ گیا تھا، ناامیدی اور کاہلی بڑھتی جاتی تھی اور بہت بڑی اکثریت رنج و غم اور آلام و مصائب میں گھری نظر آتی تھی، اس لیے کہ ایسی مفرطانہ عیش پرستی کے لیے زیادہ سے زیادہ رقوم اور آمدنی درکار تھی اور وہ ہر شخص کو مہیا نہ تھی۔ البتہ اس کے لیے بادشاہ، نواب، امرا اور حکام نے معاشی دستبرد شروع کر دی اور اس کا طریقہ یہ اختیار کیا کہ کاشتکاروں، تاجروں، پیشہ وروں اور اسی طرح دوسرے کاروباریوں پر طرح طرح کے ٹیکس عائد کر کے ان کی کمر توڑ دی اور انکار کرنے پر ان کو سخت سے سخت سزائیں دیں اور مجبور کر کے ان کو ایسے گھوڑوں اور گدھوں کی طرح بنا دیا جو آبپاشی اور ہل چلانے کے کام میں لائے جاتے ہیں اور پھر کارکنوں اور مزدور پیشہ لوگوں کو اس قابل بھی نہ چھوڑا کہ وہ اپنی حاجات و ضروریات کے مطابق بھی کچھ نہ کچھ پیدا کر سکیں۔ خلاصہ یہ کہ ظلم و بداخلاقی کی انتہا ہو گئی ۔۔۔۔

آخر جب اس مصیبت نے ایک بھیانک شکل اختیار کر لی اور مرض ناقابلِ علاج حد تک پہنچ گیا تو خدائے تعالیٰ کا غضب بھڑک اٹھا اور اس کی غیرت نے تقاضا کیا کہ اس مہلک مرض کا ایسا علاج کیا جائے کہ فاسد مادہ جڑ سے اکھڑ جائے اور اس کا قلع قمع ہو جائے ۔۔۔۔۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

... اُس نے ایک نبی اُمّی (صلی اللہ علیہ وسلم) کو مبعوث کیا اور اپنا پیغامبر بنا کر بھیجا، وہ آیا اور اس نے روم و فارس کی اُن تمام رسوم کو فنا کر دیا اور عجم و روم کے رسم و رواج کے خلاف صحیح اصولوں پر ایک نئے نظام کی بنیاد ڈالی۔

اس نظریہ کی صداقت کو صرف مسلمانوں نے ہی نہیں بلکہ دنیا کے تمام ذہین انسانوں نے قبول کیا ہے۔ چنانچہ بیبان اپنی شہرۂ آفاق کتاب "قوموں کی ترقی اور تنزل کے قوانینِ نفسی" میں لکھتا ہے:۔

"جب کوئی قوم تہذیب و تمدن کے زیور سے آراستہ اور نفوذ و قوت کے ہتھیار سے مسلح ہو جاتی ہے اور اُس کو ہمسایہ قوم کے حملے کا خطرہ نہیں رہتا تو وہ نہایت عیش و طرب کے ساتھ جو دولت کا لازمی نتیجہ ہے زندگی بسر کرنے لگتی ہے، اس لیے اس کے تمام فوجی محاسن برباد ہو جاتے ہیں تمدنی ترقی کے ساتھ ساتھ اس کی ضروریات میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ ہر شخص کے دل میں خود غرضی اپنا قدم جما لیتی ہے اور اس کا مطمحِ نظر صرف یہ ہوتا ہے کہ جو مال و دولت اس کے ہاتھ آئے اس سے نہایت سرعت کے ساتھ ذاتی فائدہ اُٹھائے۔ اس بنا پر تمام قوم عام مصالح سے اعراض کرنے لگتی ہے، اور قوم کے وہ تمام اخلاقی محاسن فنا ہو جاتے ہیں، جو اس کی عظمت کا حقیقی سبب تھے۔ اب اُس پر قرب و جوار کی وحشی یا نیم وحشی قوموں کا حملہ شروع ہو جاتا ہے، روم اور ایران کی سلطنتوں کا یہی حشر ہوا، اُن کا نظامِ حکومت اگرچہ نہایت مستحکم تھا، تاہم بربرہ نے روم کا خاتمہ کر دیا اور عربوں نے ایران کے پرخچے اُڑا دیئے۔"

دورِ حاضر کے ایک عظیم مفکر پروفیسر آرنلڈ جے ٹائن بی نے بھی اپنی جامع تصنیف "مطالعۂ تاریخ" میں اسی نظریے کی کسی حد تک تائید کی ہے۔ اس کا کہنا یہ ہے "کہ کسی تہذیب کی نشو و نما کا عام طور پر معیار یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ انسانی ماحول پر زیادہ سے زیادہ قبضہ کرے یا طبعی ماحول کو اپنے قابو میں لے آئے۔ پہلی صورت میں پڑوس میں رہنے والی اقوام کو فتح کیا جاتا ہے اور دوسری صورت میں مادّی اسباب و ذرائع میں ترقی ہوتی ہے" پھر اُس نے نہایت ہی واضح مثالوں سے اس امر کی وضاحت کی ہے کہ نہ تو فوجی تنظیم اور نہ سلطنت کی حدود کا پھیلاؤ کسی تہذیب کی ترقی کا معیار

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہیں ۔ فوجی قوت کا بڑھنا بذاتِ خود تنزل کی نشانی ہے ۔ اسی طرح پیدائش کے طریقوں میں اصلاح کا بھی کسی تہذیب کی نشوونما سے کوئی خاص رشتہ نہیں ۔ دنیا میں یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ جب قوموں میں مال و اسباب کی فراوانی ہوئی تو انہیں انحطاط نے آگھیرا ۔“

اس کے بعد وہ لکھتا ہے :۔

”اکیس تمدنوں کے مطالعہ کے بعد میرے دل نے اس حقیقت کو بالکل قبول کر لیا ہے کہ تمدن اسی وقت تک صحت مند رہتے ہیں جب تک ان میں تخلیق کی صلاحیت برسرِ عمل رہتی ہے اور وہ اپنے جغرافیائی ماحول، نقلِ مکانی یا داخلی تغیرات کے پیدا کردہ ہر چیلنج کا خیر مقدم جدید اور تخلیقی طریقوں سے کرتے چلے جاتے ہیں “

”اور جب کسی سوسائٹی میں تخلیقی قوتیں رکھنے والی اقلیت غالب ہو جاتی ہے ۔ اور پھر محض قوت کے بل پر اپنے اس وقار کو قائم رکھنے کی کوشش کرتی ہے جس کی درحقیقت وہ اہل نہیں رہتی تو حاکم اقلیت[1] کے اخلاق میں یہ انقلاب عوام کو بغاوت پر ابھارتا ہے ۔“ اور اس کے بعد کوئی دوسری قوم یا گروہ مسندِ اقتدار پر آجاتا ہے ۔“

قرآن حکیم نے اس تغیر و تبدل کی اصل وجہ یہ فرمائی ہے :۔

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُم بِبَعْضٍ	اگر اللہ تعالیٰ بعض انسانوں کو دیگر انسانوں کے

---

[1] فرانس کی شکست کا اصلی سبب یہی اخلاقی انحطاط تھا ۔ ایم بادون (M. Baudin) اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے ۔

”میں نے جنرل ویگان سے کہا تھا کہ فرانس میں صرف مادی اور فوجی وسائل کی کمی نہیں بلکہ روحانی قوت کا بھی فقدان ہے اس ملک میں اخلاقی طاقتوں کو شکست ہو چکی ہے ۔ فرانسیسی نوجوانوں کو کسی ایسے عقیدہ کی تعلیم نہیں دی گئی جس کے لیے ان کے دلوں میں جان و مال کی قربانی کا جذبہ ہو ۔ اگر ملک کو بچانا ہے تو تعمیرِ نو کا کام جلد شروع ہونا چاہیے ۔ میں نے یہ بھی کہا کہ میں ہر طرف شک و تذبذب اور عقائد کی کمزوری کے آثار دیکھ رہا ہوں ۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ فرانس کا نظم و نسق ایک نااہل حکمران طبقہ کے ہاتھ میں آگیا ہے ۔“

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لَفَسَدَتِ الْاَرْضُ — ذریعہ دفع نہ کرتا تو زمین میں فساد پھیل جاتا

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ ۔ (۲۲-۴۰)

اگر اللہ تعالیٰ بعض گروہوں کو دیگر گروہوں کے ذریعہ دفع نہ کرتا رہتا تو دیر و خانقاہ اور مساجد جن میں اللہ کا نام لیا جاتا ہے مسمار ہو جاتیں۔

مذکورۂ بالا آیات اس حقیقت کو واضح کرتی ہیں کہ اس تغیّر کی اصل وجہ یہی ہے کہ خداوند تعالیٰ یہ نہیں چاہتے کہ پوری نوعِ انسانی اخلاقی پستیوں کا شکار ہو جائے۔

جب انسانوں کا کوئی گروہ اس کارزارِ حیات میں اخلاقی شکست کھا جاتا ہے تو پھر کوئی فوجی طاقت زیادہ دیر تک اسے دنیا میں سربلند نہیں رکھ سکتی۔ وہ جلد ہی دنیا سے نیست و نابود ہونا شروع ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ ایک ایسا گروہ وجود میں آتا ہے جن کی اخلاقی بنیادیں زیادہ استوار اور مرکزی اصول زیادہ جان بخش ہوتے ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ اس عمل کے ذریعہ سے روحِ حیات کی تجدید نہ کریں اور کسی ایک ہی قوم کو غیر معین عرصہ تک اختیارات کی باگیں دے دیں، خواہ وہ اخلاقی انحطاط کی آخری حد تک ہی کیوں نہ پہنچ گئی ہو تو اس سے معاشرتی زندگی کا امن و سکون بالکل تباہ و برباد ہو جائے گا۔ چنانچہ اسی وجہ سے جب ایک جماعت کو مسندِ اقتدار سے ہٹایا جاتا ہے تو اسی وقت ایک دوسری جماعت اس کی جگہ آ لیتی ہے۔ قرآنِ حکیم نے ارشاد فرمایا ہے:

اِلَّا تَنْفِرُوْا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا وَّيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوْهُ شَيْئًا فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ وَاَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِيْنَ،

اگر تم لوگ جہاد کے لیے نہ اٹھ کھڑے ہوئے تو خدا تم کو سخت عذاب دے گا اور تمہاری جگہ دوسری قوم پیدا کر دے گا اور اس کو تم کچھ نقصان نہ پہنچا سکو گے۔ ہم نے ان کے گناہوں کے باعث ان کو ہلاک کر دیا اور اس کے بعد دوسرے لوگوں کو پیدا کیا۔

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ مَّآ اُرْسِلْتُ بِهٖٓ اِلَيْكُمْ وَيَسْتَخْلِفُ رَبِّيْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ

اگر تم اعراض کرتے ہو تو میں نے اپنا پیغام تم تک پہنچا دیا۔ میرا رب تمہارے سوا کسی دوسری قوم کو اپنا جانشین بنا لے گا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وَلَا تَضُرُّوْنَهٗ شَيْئًا۔ اور تم اسے کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتے۔

علامہ ابن خلدون اسی کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"جب بانیانِ سلطنت عیش و طرب میں مصروف ہو جاتے ہیں تو اپنے دوسرے بھائیوں کو غلام بنا لیتے ہیں اور ان کو سلطنت کے کاروبار میں لگا دیتے ہیں۔ لیکن جن لوگوں نے سلطنت میں کوئی حصہ نہیں پایا ہے چونکہ انہوں نے ناز و نعم میں زندگی نہیں بسر کی ہے اس لیے وہ نوجوان باقی رہتے ہیں اور جب پہلے لوگ عیش پرستی کی وجہ سے بوڑھے ہو جاتے ہیں تو دوسرے گروہ کی عصبیت تازہ رہتی ہے۔ اسی بنا پر وہ اپنا مرجع امید اس ملک کو بنا لیتے ہیں جس سے وہ روک دیئے گئے تھے۔ چنانچہ عرب میں جب عاد کی سلطنت کا خاتمہ ہوا تو ان کے بھائی ثمود صاحب تخت و تاج ہوئے۔ ثمود کے بعد عمالقہ، عمالقہ کے بعد حمیر۔ حمیر کے بعد تبابعہ اور تبابعہ کے بعد اذواء کا دور دورہ ہوا۔ اس کے بعد مصر کی حکومت قائم ہوئی۔"

وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ۔ (اور یہ زمانہ کے انقلاب ہیں جن کو ہم لوگوں میں گردش دیتے رہتے ہیں۔)

© rasailojaraid.com